

# علی گڑھ ڈائریوریہ - ۱۶

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے صد سالہ جشن کے فناء (دسمبر ۲۰۲۱ء) کی تقریب سے شروعات

آسمان علی گڑھ کا ایک ٹوٹا ہوا تارہ: رضا پوسٹ گریجویٹ کالج میں شعبہ اردو کا چیئر مین

## آفتاب شمس

امن کے ہم متوالے! سب ایک ہیں! ایک ہیں! ایک ہیں!

میں/ ہر چیز دکانوں سے اٹھ کر، روپوش ہوئی تہ خانوں میں/ بد  
حال گھروں کی بد حالی، بڑھتے بڑھتے جنجال بنی/ مہنگائی بڑھ کر  
کال بنی، ساری بستی لنگال بنی/ چرواہیاں رستہ بھول گئیں،  
پنہاریاں بنگھٹ چھوڑ گئیں/ کتنی ہی کنواری ابلائیں، ماں باپ کی  
چوٹ چھوڑ گئیں/ افلاس زدہ دہقانوں کے بل تیل بکے، کھلیاں  
بکے/ جینے کی تمنا کے ہاتھوں، جینے ہی کے سب سامان  
بکے/...../ تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

.....  
بستی کی ہراک شاداب گلی خوابوں کا جزیرہ تھی گویا  
ہر موج نفس، ہر موج صبا نغموں کا ذخیرہ تھی گویا  
.....  
ناگاہ لپکتے کھیتوں سے ٹاپوں کی صدائیں آنے لگیں  
بارودی بو جھل بولے کر پچھم سے ہوائیں آنے لگیں  
تغیر کے روشن چہرے پر تجریب کا بادل پھیل گیا  
ہر گاؤں میں وحشت ناچ اٹھی، ہر شہر میں جنگل پھیل گیا

آفتاب شمس، شہر یار کے دوست بھی تھے، کلاس فیلو بھی،  
ان کی تعریف میں کہا کرتے تھے کہ آفتاب علی گڑھ میں رہ جاتے  
تو ہمیں سب کو پیچھے چھوڑ جاتے، آفتاب شمس اور ان کی نسل کے  
شاعر دماغ سے زیادہ دل کی شاعری کیا کرتے تھے۔ اور سب  
دل والے ایک ہی گیت گارہے تھے کہ امن کے لئے جینا سیکھو  
اور امن کے لئے مرنا۔  
کیا زبردست شاعر تھے: ایک کھپ کی کھپ، ایسے بلند وبالا  
قد کے، کہ ان کی نظیر نہ پہلے کبھی ملی نہ آگے کبھی۔ یہ سب کے سب

تہارے گھر میں قیامت کا شور برپا  
ہے/ محاذ جنگ سے ہر کارہ تار لایا  
ہے/ کہ جس کا ذکر تمہیں زندگی سے پیارا  
تھا/ وہ بھائی ”نزعہ دشمن“ میں کام آیا  
ہے/ تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

شہر یار نے یہ شعر تو نہیں لکھا تھا مگر یہ شعر پڑھتے تو اصغر گوٹوی کی جگہ شاید آفتاب  
کا نام لے لیتے:

صنم خانے میں کیا دیکھا کہ جا کر کھو گیا شمس  
علی گڑھ کا حرم ہوتا تو، ظالم شیخ دیں ہوتا

آفتاب شمس، اور شہر یار اور آفتاب کے مشترکہ زمانے کو یاد کر کے آفتاب کی شاعری  
کا دیر تک چرچا کرتے رہے اور کہتے رہے کہ ہم لوگوں میں سب سے زیادہ ذہین،  
شارپ، اور اچھے شعر کہنے والا تھا، علی گڑھ نے اسے کھو کر اپنا بھی نقصان کیا اس کا  
بھی۔ اور پہلی بھیت، علی گڑھ، رامپور رضا پوسٹ گریجویٹ کالج! اور پھر!  
علی گڑھ کو واپسی کبھی نہ ہوئی۔

چالیس بیسویں کے بعد کی جنگ زدہ دنیا کو امن کا  
پیغام دینے کے لئے نکل پڑے تھے، سردھڑکی  
بازی لگائے! فیض کہہ رہے تھے: ”بول کہ لب  
آزاد ہیں تیرے“ اور ساحر کہہ رہے تھے:  
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

یہی فضا تھی، یہی رت، یہی زمانہ تھا  
یہیں سے ہم نے محبت کی ابتدا کی تھی

رواں ہے چھوٹی سی کشتی ہواؤں کے رخ پر  
ندی کے ساز پر ملاح گیت گاتا ہے  
تمہارا جسم ہراک لہر کے جھکولے سے  
مری کھلی ہوئی باہوں میں جھول جاتا ہے  
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

میں پھول ٹانگ رہا ہوں تمہارے جوڑے میں  
تمہاری آنکھ مسرت سے جھکتی جاتی ہے  
نہ جانے آج میں کیا بات کہنے والا ہوں  
زبان خشک ہے آواز رکتی جاتی ہے  
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

مرے پلنگ پہ بکھری ہوئی کتاہوں کو  
ادائے عجز و کرم سے اٹھا رہی ہوں  
سہاگ رات جو ڈھوک پہ گائے جاتے ہیں  
دبے سُر میں وہی گیت گارہی ہوں  
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

اب ساحر کی  
پرچھائیاں کے بعد آفتاب  
شمسی جنگ اور نفرت کی  
خون ریزی سے لڑنے کے لئے  
نکل آتے ہیں، جس کی  
علامت ہوتی ہے ایک سپاہی  
کی وردی جس کی جیب سے

ڈائری کا ایک ورق نکلتا ہے۔ ساحر ایک سین دکھا چکے،  
اب دوسرا سین شروع ہوتا ہے۔ اور قلم سے کاری زخم لگانے کی  
باری اب ساحر کے بعد آفتاب کے ہاتھ میں ہے، ایک سپاہی کی  
وردی کی جیب سے ایک پڑہ نکلتا ہے جس پر لکھا ہے:

ایک سپاہی کی وردی سے  
بچوں کی فوٹو کے علاوہ  
چھوٹی سی اک ڈائری نکلی  
جس کے پہلے ہی صفحے پر  
موئے لفظوں میں لکھا تھا  
”مٹی کی گڑیا لینی ہے  
راجو کی اسٹاک اور گیند  
پاروتی کی ریشمی ساری  
ماتاجی کی ادنی شال“

خاموش زمیں کے سینے میں خیموں کی طنائیں گڑنے  
لگیں/ لکھن سی ملائم راہوں پر بوٹوں کی خراشیں پڑنے  
لگیں/ فوجوں کے بھیانک پیڈل تلے چرخوں کی صدائیں ڈوب  
گئیں/ جیبوں کی سلکتی بھول تلے پھولوں کی قبائیں ڈوب گئیں/  
انسان کی قیمت گرنے لگی، اجناس کے بھاؤ چڑھنے لگے/ چوپال  
کی رونق گھٹنے لگی، بھرتی کے دفاتر بڑھنے لگے/ بستی کے پھیلے شوخ  
جواں، بن بن کے سپاہی جانے لگے/ جس راہ سے کم ہی لوٹ  
سکے اس راہ پر راہی جانے لگے/ ان جانے والے دستوں میں  
غیرت بھی گئی، برنائی بھی/ ماؤں کے جواں بیٹے بھی گئے، بہنوں  
کے چہیتے بھائی بھی/ بستی پہ اداسی چھانے لگی، میلوں کی بہاریں  
ختم ہوئی/ آموں کی پگتلی شاخوں سے جھولوں کی قطاریں ختم  
ہوئیں/ دھول اڑنے لگی بازاروں میں، بھوک اگنے لگی کھلیاؤں

اُدھر کو یا اُدھر والوں نے اُدھر والوں کو مار دیا۔ شمالی مشرقی اور شمالی مغربی علاقوں میں لوگ امن کے لئے ترستے رہتے ہیں۔

یہ جنگ وجدل اور خون خرابہ جو ساحر نے اپنی جوانی میں انتالیس۔ پینتالیس (45-1939) کی جنگ میں دیکھا تھا جب ناگاساکی اور ہیروشیما خاک و خون میں لوٹے تھے، پھر جنگ کے بعد سینتالیس آیا

ع وہ تیغ اپنے ہی دل میں نیام ہوتی رہی  
ع ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب

یعنی لاکھوں ماں جائے ایک دوسرے کو مارتے رہے۔ پھر سینتالیس کو پچیس برس نہ گزرے تھے کہ بگلہ دیشی خون اور پاکستانی خون، ایک دوسرے کو کاٹ کے خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ پھر اکہتر کی خون ریزی کو چودہ پندرہ سال مشکل سے گزرے تھے کہ سکھ اپنے ہی وطن میں بے وطن ہو گئے۔ اندرا گاندھی کا قتل تو ایک بہانہ تھا نفرت کا لاوا تو ذرا سے اشارے پر پھوٹ پڑتا ہے، ہزاروں لوگ مارے گئے۔ اور پھر ادھر دنگا، اُدھر فساد، اُدھر جنگ، اُدھر جنگ۔ یہ آدمی کو کیا ہو گیا ہے۔ اور ہم، ہمارے بچے، سپاہی بن کر، ایک دوسرے پر اس طرح گولیاں برساتے ہیں، اور توپوں کے دبانے کھول دیتے ہیں، اور دونوں طرف ایک ہی ماں کے بچے، جوان کی سگی ماں تھی اور ہے، مارا ماری کرتے رہتے ہیں، سپاہی مرتے رہتے ہیں، پھر دوسرے سپاہی ان کی جگہ بھرتی ہو جاتے ہیں، پھر مرنے کے لئے اور مارنے کے لئے۔ ساحر کہتا ہے، اُس سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں جس راہ سے کم ہی خوش قسمت لوٹ کے آتے ہیں۔ وہ خوش قسمتی کی راہ نکلنے والا، جس کی جیب سے ایک ڈائری نکلی تھی، اگلے دن اپنوں سے ملنے کے لئے روانہ ہونے والا تھا۔ بوڑھی ماں اور بوڑھا باپ اور اس دن تک اپنے کو سہاگن سمجھنے والی پتی اور ان کی معصوم بچی، دروازے کی راہ تک رہے تھے کہ اس سپاہی کی جگہ رجیمینٹ کے افسر کا بھیجا ہوا ایک تار پہنچا، تار کے ساتھ سپاہی کی ڈائری کا آخری ورق، جس پہ سپاہی کی آخری یادداشت لکھی ہوئی تھی:

ایک سپاہی کی وردی سے  
بچوں کو فوٹو کے علاوہ  
چھوٹی سی اک ڈائری نکلی

جس کے پہلے ہی صفحے پر  
موٹے لفظوں میں لکھا تھا  
”مٹی کی گڑیالی ہے  
راجو کی اسٹک اور گیند  
پاروتی کی ریشمی ساری  
ماتاجی کی اونی شال“

یہ سب دیوانے جوشا کہلاتے ہیں، ساحر بھی اور آفتاب بھی جن میں شامل ہیں، سب مل کر ایک پیغام دے رہے ہیں: امن کے ہم متوالے!

ہم ایک ہیں! ہم ایک ہیں! ہم ایک ہیں!

☆☆☆

آفتاب شمش نے پر چھائیاں ضرور پڑھی ہوگی مگر اس کا عکس دوسرے رنگ میں جھلکا جب آفتاب نے ساحر کے بیس سال بعد اپنا پہلا مجموعہ لحوں کا حصار پڑھوایا اور ساحر کے انسپریشن (=ساحر کے حصار میں رہ کر) ساحر سے آگے بڑھ کر، لحوں کے حصار میں شامل یہ تین نظمیں لکھی تھیں: دل کے خون میں انگلیاں ڈبو کر بس ایسے ہی لکھا جاتا ہے:

ایک سپاہی کی وردی سے/ بچوں کو فوٹو کے علاوہ/ چھوٹی سی اک ڈائری نکلی/ جس کے پہلے ہی صفحے پر/ موٹے لفظوں میں لکھا تھا/ ”مٹی کی گڑیالی ہے/ راجو کی اسٹک اور گیند/ پاروتی کی ریشمی ساڑی/ ماتاجی کی اونی شال“

اُجلے صاف رسوئی گھر میں/ ماں کے آنسو گر توے پر  
/ اگر گر کر جلتے جاتے ہیں/ باپ اپنے میلہ دامن سے/ بھیگی آنکھیں پونچھ رہا ہے/ اک بچی ماں کے گھونگھٹ میں/ کا جل بہتا دیکھ رہی ہے/ فوجی وردی پہنے کوئی/ آنگن میں تیار کھڑا ہے / تانگے کے گھنکر ورن کسب/ دروازے پر جمع ہوئے ہیں/ رو کر بیٹھ گئے سب لیکن/ اکھیتوں کے اس پار ابھی تک/ تانگے کے گھنکر وجہتے ہیں۔

وہی لنگڑا ضعیف العمر فوجی / کہ جس کا اک جوان العمر بیٹا/ گذشتہ جنگ میں مارا گیا ہے/ سڑک کے موڑ پر پتیل کے بیچے/ بٹھا ہے گود میں پوتے کو اپنے/ گزرتی لاریوں کو تک رہا ہے / کہ جن میں وردیاں پہنے سپاہی/ دماغ اور دل سے لڑ کر اک لڑائی/ محاذ جنگ پر یوں جا رہے ہیں/ کہ جیسے کوئی لڑکی کمسنی میں / مہاجن کی رقم دینے کے کارن/ کسی زردار بوڑھے بواہوں کو/ زبردستی بیانی جا رہی ہو!

امن اور شائقی اور سکون اور محبت - اردو کے بزرگترین شاعر کا کہنا ہے کہ (معمولی تریم کے ساتھ)  
ہیں یہ وہ لفظ جو شرمندہ معنی نہ ہوئے۔

شرمندہ معنی ہوتے ہیں بد امنی، آویزش، جنگ اور نفرت: ایسا کیوں ہوتا ہے؟

آدمی تو عام حالات میں ایک دوسرے سے شرافت کا، خلوص کا بیوہ کرنا چاہتا ہے، ہر سینے میں پیار کی پھواریں، پتھر والے سینوں میں سے بھی پھوٹی پڑتی ہیں، جب سینہ دار کو یاد آتا ہے کہ وہ تو انسان ہے۔ انسان ہی پیدا ہوا تھا۔ اور اسی نوے سال گزار کے اسی مٹی میں رمل مل جانا ہے۔ پھر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ایران عراق برسوں ایک دوسرے کا خون بہاتے رہے۔ بچے جوان ہوتے رہے اور ایک دوسرے کو مرتے مارتے رہے۔ میانمار میں امن چاہنے والوں کا قتل ہوتا رہا۔ لکا میں، نائل غیر نائل ایک دوسرے کے خون سے اپنی پیاس بجھاتے رہے۔ ہندوستان اور پاکستان ماں جائے ایک دوسرے کے بھائی: اور خبریں آتی ہیں کہ سرحد پر اُدھر والوں (فوجی) نے

اب ساحر پھر در آتے ہیں:  
تمہارے گھر میں قیامت کا شور برپا ہے/ محاذ جنگ سے ہر کارہ تار لایا ہے کہ جس کا ذکر تمہیں زندگی سے پیارا تھا/ وہ بھائی ”نرغہ دشمن“ میں کام آیا ہے/ تصورات کی پر چھائیاں ابھرتی ہیں/.....

سورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی وہ شام ہے اب تک یاد مجھے  
/...../ اس شام مجھے معلوم ہوا، کھیتوں کی طرح اس دنیا میں/ سہمی ہوئی دوشیزاؤں کی مسکان بھی پہنچی جاتی ہے/ اس شام مجھے معلوم ہوا، اس کا رگہ زرداری میں/ دو بھولی بھالی روجوں کی پہچان بھی پہنچی جاتی ہے/ اس شام مجھے معلوم ہوا، جب باپ کی کھیتی چھن جائے/ ممتا کے سنہرے خوابوں کی انمول نشانی بقی ہے/ اس شام مجھے معلوم ہوا، جب بھائی جنگ میں کام آئیں/ سرمائے کے قحبہ خانے میں بہنوں کی جوانی بکتی ہے/ سورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی وہ شام ہے اب تک یاد مجھے  
/...../ مجبور ہوں میں، مجبور ہوں تم، مجبور یہ دنیا ساری ہے/ تن کا دکھن پر بھاری ہے/ اس دور میں جینے کی قیمت، یاد دار ورن یا خواری ہے/.....

جینے کو جئے جاتے ہیں مگر، سانسوں میں چٹائیں جلتی ہیں/ خاموش وفا نہیں جلتی ہیں/ سنگین حقائق زاروں میں، خوابوں کی ردائیں جلتی ہیں/...../ پھر موت کی آندھی اٹھی ہے، پھر جنگ کے بادل چھائے ہیں/.....

بہت دنوں سے ہے یہ مشغلہ سیاست کا/ کہ جب جوان ہوں بچے تو قتل ہو جائیں/ بہت دنوں سے ہے یہ خط حکمرانوں کو/ کہ دور دور کے ملکوں میں قحط ہو جائیں/.....

چلو کہ چل کے سیاسی مقامروں سے کہیں/ کہ ہم کو جنگ وجدل کے چلن سے نفرت ہے/ جسے لہو کے سوا کوئی رنگ راس نہ آئے / ہمیں حیات کے اس پیر بن سے نفرت ہے/ کہو کہ اب کوئی قاتل اگر ادھر آیا/ تو ہر قدم پہ زین تنگ ہوتی جائے گی/ ہر ایک موج ہوا رخ بدل کے چھپنے گی/ ہر ایک شاخ رگ سنگ ہوتی جائے گی/ اٹھو کہ آج ہر اک جنگ جو سے یہ کہیں/ کہ ہم کو کام کی خاطر کلوں کی حاجت ہے/ ہمیں کسی کی زین چھیننے کا شوق نہیں/ ہمیں تو اپنی زین پر بلوں کی حاجت ہے/ کہو کہ اب کوئی تاجر ادھر کا رخ نہ کرے/ اب اس جگہ کوئی کنواری نہ پہنچی جائے گی/ یہ کھیت جاگ پڑے، اٹھ کھڑی ہونیں فصلیں/ اب اس جگہ کوئی کیاری نہ پہنچی جائے گی/ یہ سر زمین ہے گوتم کی اور نانک کی/ اس ارض پاک پہ وحشی نہ چل سکیں گے بھی/ ہمارے خون پہ لشکر نہ چل سکیں گے بھی/ کہو کہ آج بھی ہم سب اگر غمخوار رہے/ تو اس دیکھتے ہوئے خاکدان کی خیر نہیں/ جنوں کی ڈھالی ہوئی آئینی بلاؤں سے/ زین کی خیر نہیں، آسمان کی خیر نہیں/...../ تصورات کی پر چھائیاں ابھرتی ہیں۔

آفتاب شمش ہائی اسکول کے طالب علم رہے ہوں گے جب ساحر (لدھیانوی) نے یہ سب کچھ لکھا تھا۔

# سرسید کا احتجاجی کردار ۲

سرسید کی کچھ بھولی بسری تحریروں کی پیشکش: انتخاب از پردیسر سید ابوالخیر کشفی مرحوم

**شافع قدوائی کے ردیف قافیے میں ’انگریزی راج کا سب سے بڑا باغی: سرسید‘ کے عنوان سے پہلی قسط ڈانہ پورہ نمبر ۱۵، میں آئی تھی، اب یہ دوسری قسط شافع قدوائی کا عنوان مستعار لے کر اس ڈانہ پورہ ۱۶، میں ’ابوالخیر کشفی انتخاب‘ میں دی جا رہی ہے۔ ساتھ ہی شافع قدوائی کے بڑے خوبصورت مضمون سے ضروری اقتباسات بھی شامل کیے جا رہے ہیں۔ پڑھیے اور فخر کیجئے کہ کیا آپ ہندوستان کے ایک اتنے بڑے آدمی کے بنائے ہوئے علی گڑھ کے فرزندوں میں اپنے آپ کو شمار کر سکتے ہیں۔**

## غلامی گناہ ہے

یہ سمجھنا کہ اگر غلام آرام و آسائش سے رکھے جاویں اور رحم و محبت سے پرورش کئے جائیں گے تو کوئی برائی نہیں ہے، محض غلطی اور سرتا سر دھوکا ہے۔ غلامی فی نفسہ ایک قدرتی گناہ ہے اور ان کو بدسلوکی سے رکھنا دوسرا گناہ ہے۔ پس کوئی چیز قدرتی گناہ سے زیادہ خوفناک نہیں ہے۔

غلامی تمام اخلاق انسانی کو خراب کرنے والی ہے۔ غلاموں کے حالات اور ان کی عقل اور عادات انسانی حالت سے تنزل کر کے حیوانی حالت میں آجاتے ہیں، اور جو لوگ غلام بناتے ہیں وہ جبراً اور ناانصافی سے انسان کو جو اشرف المخلوقات ہے تنزل کی حالت میں ڈالتے ہیں۔ غلامی کی حالت میں انسان کے تمام قدرتی قویٰ جن کو خدا نے وسیلہ ترقی بنایا ہے معطل و بے کار ہو جاتے ہیں اور ان کی حالت ہر طرح پران کی ترقی کی، جن کی ترقی کرنا قدرت کے قانون بنانے والے قادر مطلق کی مرضی ہے، مانع ہوتی ہے۔

## سچا ریڈیکل

”..... میں مسلمان ہوں، ہندوستان کا باشندہ ہوں اور عرب کی نسل سے ہوں۔ انہیں دو باتوں سے کہ میں عرب کی نسل سے ہوں اور مسلمان ہوں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مذہب اور خون دونوں کے لحاظ سے میں سچا ریڈیکل ہوں۔ اہل عرب اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ بجائے اس کے کہ وہ خود اپنے اوپر حکومت کریں، کوئی اور ان پر حکومت کرے۔ اس وقت تک اہل عرب آزاد ہیں اپنے مشائخ کے جھنڈوں کے نیچے رہتے ہیں۔ وہ سلطان ترکی کو سلطان نہیں کہتے بلکہ اپنے زبان و عمل سے ویران اور پتھریلے جزیرہ نما کا خادم سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی آزادی کو تمام دنیا کی نعمتوں سے بہتر جانتے ہیں، اونٹ چراتے ہیں، پر زندگی بسر کرتے ہیں، اونٹنیوں کا دودھ پیتے ہیں اور اپنی آزادی میں خوش رہتے ہیں۔

ابھی تک میری رگوں میں عرب کا خون گردش کرتا ہے اور پھر میرا مذہب یعنی اسلام جس پر مجھے پورا اور پکا یقین ہے وہ بھی ریڈیکل اصولوں کو سکھاتا ہے اور شخصی گورنمنٹ سے موافق نہیں

اور نہ لمیٹڈ مائز کی کو مانتا ہے بلکہ موروثی حکومت ناپسند کرتا ہے۔ ایک پریزیڈنٹ جس کو لوگ منتخب کریں، اس کو اسلام پسند کرتا ہے اور اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ دولت ایک جگہ اکٹھی رہے۔ اسی اصول کے موافق اسلام کے بانی نے یہ قاعدہ بنایا کہ بعد فوت ہو جانے کسی شخص کے اس کی جائیداد بہت سے آدمیوں میں تقسیم ہو جاوے کیونکہ کتنی ہی زیادہ جائیداد کیوں نہ کہ وہ بعد دونسلوں کے یقیناً بہت سے حصوں میں تقسیم ہو جاوے گی۔ پس میں دونوں طرح، کیا بالحاظ مذہب اور کیا بالحاظ خون کے ریڈیکل ہوں۔

لیکن ہمارا مذہب جس نے یہ خیالات آزادی کے میرے دل میں پیدا کئے اس نے اور باتیں بھی سکھائی ہیں۔ ایک یہ کہ اگر خدا کے حکم سے ہم کسی ایسی قوم سے مفتوح ہو جائیں جو کہ ہم کو مذہبی آزادی دیتی ہے، انصاف سے ہم پر حکمرانی کرتی ہے، تو اس حالت میں ہم کو اس کا تابع اور خیر خواہ رہنا چاہئے۔ دوسرے یہ کہ وہ ریڈیکل اصول جو ہم نے اپنے باپ دادا اور اپنے مذہب سے سیکھے ہیں، ان پر ہم کو صرف اسی حالت میں عمل کرنا چاہئے جب کہ زمانے کی حالت ان کے عمل میں لانے کے موافق ہو، نہ کہ اس حالت میں جب کہ زمانے کے حالات ان کے موافق نہ ہوں۔ مثلاً جبکہ ان کے اختیار کرنے سے ملک کے اندرونی امن یا گورنمنٹ کے قائم رہنے میں فرق آوے یا اس کو کمزور اور ضعیف کر دے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ ہر ایک قوم اور ہر ایک خیال کے لوگ خواہ وہ کنسرویٹو ہوں، خواہ لبرل اور خواہ ریڈیکل، سب اسی اصول کو قبول کریں گے.....“ (ایک معزز انگریز کے نام خط : ”حیات جاوید“ سے نقل کیا گیا)

\*

نماز نہ پڑھنے کا صرف ایک گناہ ہے جس کے بخشے جانے کی توقع ہے، مگر کسی شخص (انگریز ڈپٹی کمشنر) کے منع کرنے سے نہ پڑھنا میری سمجھ میں کفر ہے

(حیدر آباد دکن میں اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہونے سے پہلے مولوی مشتاق حسین ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں معمولی اہل کار تھے۔ انگریز ڈپٹی کمشنر نے عدالت کے اوقات میں جماعت کے ساتھ نماز ظہر کی ادائیگی سے انہیں منع کیا۔ انہوں نے سر سید کو سارا معاملہ لکھ بھیجا۔ سر سید کا جواب ملاحظہ ہو۔)

بھائی مشتاق حسین! کل میں سارا دن مترد رہا، کیونکہ تمہارا کوئی خیال نہیں آیا تھا۔ آج خط آیا اور حال معلوم ہوا۔ گو میں کسی وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور کسی وقت کی نہیں پڑھتا اور وقت بے وقت کا بھی خیال نہیں کرتا، دودھ اکٹھی بھی ملا کے پڑھ لیتا ہوں۔ ریل میں لمبا سفر ہو تو مجھ سے نماز ادا نہیں ہوتی۔ یہ سب باتیں مجھ میں ہیں اور نالائق اور شامت اعمال سے ایسی سستی نماز میں ہے۔ مگر تم نے اس معاملے میں جو پیش آیا نہایت لچر بنا کیا۔ نماز جو خدا کا فرض ہے اس کو ہم اپنی شامت اعمال سے جس خرابی سے ہوا داکریں یا قضا کریں، لیکن کوئی شخص اگر کہے کہ ”تم نماز نہ پڑھو“ اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ بات سنی بھی نہیں جاسکتی۔ میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنے کا صرف گناہ ہے جس کے بخشے جانے کی توقع ہے۔ اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے جو کبھی بخشنا نہ جائے۔ تم کو پہلے ہی اپنی طرف سے ایسا طریقہ اختیار کرنا تھا جو کبھی اس قسم کی جث نہ آتی۔ اور جب ایسا طریقہ نہیں کیا تھا تو پھر لچلانا اور گڑگڑانا کیسا۔ ”حضور رخصت ہی دیں۔“ ”تنخواہ کاٹ لیں“ کہنا واہیات تھا۔ تراق سے استعفاء دے دینا تھا اور صاف کہہ دینا تھا کہ ”میں اپنے خدائے عظیم الشان، قادر مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا نہ آپ کی۔“ کیا ہوتا، نوکری نہ میسر ہوتی، فاقے مر جاتے۔ نہایت اچھا ہوتا۔ (بنام نواب وقار الملک، مولوی مشتاق حسین)

## لکھنؤ کے علی گڑھ اولڈ بوائز نے ۱۷/ اکتوبر کی عید منائی

اس بار بہت سی جگہوں کی طرح لکھنؤ میں بھی علی گڑھ اولڈ بوائز نے سترہ اکتوبر کی عید منائی۔ مہمان خصوصی فیضان مصطفیٰ تھے، اور جنرل ضمیر الدین شاہ تھے، اور لائق احترام لکھنؤ اولڈ بوائز۔ منتظمین میں خاص اولڈ بوائز ڈاکٹر مبشر تھے، اور ڈاکٹر عظمیٰ۔

بڑا شاندار جلسہ ہوا۔ جلسہ میں بہت مزے مزے کی باتیں بھی ہوئیں، جن میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ ”معتزین یہ کہتے ہیں کہ بس سرسید ڈنر ہو جاتا ہے، اور کچھ نہیں ہوتا“، جس کا جواب یہ ہے کہ وہ بھی ہو یہ بھی ہو۔ کوئی نماز پڑھنے جا رہا ہو تو اس پر یہ بھی پابندی لگانا کہ روزہ بھی رکھو۔ دراصل دونوں اپنے اپنے وقت پر ضروری ہیں۔ مگر اب جو سنانے کی خاص باتیں ہیں، وہ ہم آپ کو سنائیں:

### فیضان مصطفیٰ نے کہا:

• سرسید کو تو مانتے ہو، مگر سرسید کی نہیں مانتے، جو کہتے تھے کہ ”ہم دُشمنوں سے کوئی شکایت ہو یا سرکار سے، دونوں صورتوں میں شکایات دور کرنے کا کوئی بھی طریقہ اپنا سکتے ہو، سوائے violence کے۔“

• رہی یکساں سول کوڈ کی بات، تو قرآن میں اور اسلام میں اور سیرت رسول میں ہمارے لئے مکمل ہدایات موجود ہیں۔ اور ہمارے فقہیوں نے اچھی طرح غور و فکر کر کے ہمارے لئے اسلام کو اور زندگی کو آسان بنا دیا ہے۔ اور وہ یہ کہ طلاق کے پانچ طریقے ہیں، اور یہ کہ طلاق کا صرف ایک ہی طریقہ نہیں ہے، جسے لے کر مسلم دشمن، اسلام کو دنیا بھر میں بدنام کرتے رہتے ہیں؛ پانچ طریقے ہیں۔ ان میں ایک یہ بھی ہے کہ طلاق بیکطرفہ کے بجائے دونوں فریق یعنی دونوں کی مرضی کو شامل ہو، جہی طلاق فاعل ہوگی۔

فیضان مصطفیٰ نے یہ بھی کہا تھا کہ روس میں رہنے والا روسی کہلاتا ہے جرمن، تو ہندوستان میں رہنے والا دھرم اور مذہب کے لحاظ سے مسلمان ہو یا ہندو یا سکھ ہو، ہندوستانی ہونے کے لحاظ سے ہندوستانی کہلائے گا۔ اب اسے ہندو۔ استھانی کہیے (ہندوستانی) یا ہندو کہیے۔ فیضان مصطفیٰ نے کہا کہ ہندوستان کو مہمان دیش بنانے کے لئے ساری سوچ نہ سہی، بڑا حصہ سرسید ہی کا فیضان ہے۔ آج بھی علی گڑھ ہندوستان کو ترقی کے راستے پر چلانے کے لئے بہت کچھ روشنی دے سکتا ہے۔

# سرسید کا احتجاجی کردار

پیشکش: پروفیسر شافع قدوائی

(۱۸۵۷ء کے بعد) وہابیوں کی گرفتاری اور ان کے خلاف تعزیری کارروائی کی مزاحمت کا اولین سراغ سرسید کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ملتا ہے۔ گزٹ نے وہابیوں کے خلاف حکومت کی کارروائی کو بعض مفسد ہندوستانیوں کی سازش قرار دیا اور مخبروں پر انحصار کرنے کے لیے حکومت کو ہدف ملامت بناتے ہوئے اپنے ایک ادارے میں لکھا:

”گورنمنٹ سے اس بات کی درخواست ہے کہ جو کچھ بھی اس معاملہ میں کرے حتیٰ الامکان تامل اور حلم کے ساتھ کرے تاکہ اس کی تدبیر مملکت میں یہ امر خلل انداز نہ ہو۔ اور ایسے نازک معاملہ میں حد سے زیادہ تعجیل نہ فرمائے جس کے سبب سے خفیف خفیف باتوں پر لوگوں کو گرفتار کرتی ہے۔ کیا وہ اپنی پائیدار اور مستحکم حکومت میں ایسی خائف ہے کہ ذرا سے دھوکے سے اپنے معاندین کا خوف کرنے لگتی ہے؟ پس اس لحاظ سے ہماری رائے یہی تھی اور اب بھی ہے کہ اگر سرکار کو کسی قسم کا اندیشہ مفسدوں کی طرف سے ہو تو اس اندیشے کو آداب سلطنت کے موافق اس خوبصورتی سے رفع فرمائے کہ مفسدوں کو اس سے خوف ہو نہ کہ سرکار کے خائف ہونے کا تو ہم ہو۔ اور اس کی صورت یہی ہے کہ جو لوگ دراصل مفسد ہیں ان کے حالات پر نہایت تحقیق و تامل کی نظر کر کے ان کی بیخ کنی کرے اور اس امر کو ہرگز قرین صواب نہ خیال فرمائے کہ جس شریف و ذی عزت کی نسبت کسی مفسد یا بد معاش کے کہنے سے شبہ ہو جائے تو فوراً اس کو اول گرفتار کیا جائے اور جب بخوبی اس کی آبروریزی ہو جائے اور اس عرصہ میں اس کا بے قصور ہونا ثابت ہو جائے تو اس کو رہا کر دیا جائے۔ اس تدبیر سے بجز اس بات کے کہ رعایا بادل ہو اور کوئی فائدہ متصور نہیں ہے۔ بعض مفسد اپنا شعار یہی قرار دیتے ہیں کہ وہ اپنی قدیمی عداوتوں کو ایسے وقت پر نکالیں اور مخبری سے اپنا روسیہ کر لیں، اور اس سے ان کو کچھ بحث نہیں ہوتی کہ انجام کار ہمارے لیے یا سرکار کے انتظام میں اس سے کیا خلل ہوگا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ فی زمانہ اضلاع پنجاب میں مخبری کا بازار نہایت گرم ہے اور مفسدوں اور بد معاشوں کے ہاتھ سے شرفا کی جان عذاب میں ہے۔“

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، یکم مارچ 1871ء)

شمال مغربی صوبہ کی حکومت گزٹ کی کئی سو کا پیاس خریدتی تھی اور انہیں مختلف اسکولوں کو بھیجا جاتا تھا۔ اس مضمون کا تیز لہجہ حکومت برداشت نہیں کر سکی اور پہلی بار شمال مغربی صوبہ کے کسی اخبار کو سرکاری وارننگ جاری کی گئی۔ اس وارننگ سے گزٹ کے احتجاجی کردار کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ وارننگ 20 اپریل 1875ء کو جاری کی گئی اور اس کا آفیشیل میونسبر 69999 تھا۔ اس وارننگ کی اصل عبارت ملاحظہ کریں:

"Undersigned is directed to invite the attention of the editor of the Aligarh Institute Gazette to the improper and injustice of the criticism hazard at page no. 181 and 182 of the issue of the 19th March 1875 and to remind him that the paper is taken by the government cannot be expected to subscribe to any paper which expresses opinion on those in the article in question".

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، 13 اپریل 1875ء)

پروفیسر شافع قدوائی کا ایک تحفہ: سرسید کا احتجاجی کردار (ماہنامہ تہذیب الاخلاق، اکتوبر 2022)



# نارنگ پر ایک اچھا مضمون

از ف۔ سین۔ اعجاز

کے چہرے پر چہرے میں بھی رہے۔

پروفیسر نارنگ کی پاکستان میں بھی اسی قدر عزت تھی جتنی ہندوستان میں۔ بقول ناول نگار و افسانہ نویس انتظار حسین کے، ”وہ (نارنگ) جب پاکستان آتے ہیں ہندوستان کو ایک اکائی کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ یہ بات میں کسی اور کے لئے نہیں کہہ سکتا۔ جب وہ اسٹیج پر آتے ہیں ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ پورا ہندوستان مجموعی طور پر ہم سے مخاطب ہے۔“ ہندی افسانہ نگار کلکشور کا یہ قول مشہور ہے کہ ہر زبان کو ایک گوپی چند نارنگ کی ضرورت ہے۔

نارنگ کی مقبولیت اور تعظیم ہر اس ملک میں تھی جہاں وہ جاتے تھے۔ انہوں نے کئی ممالک کا سفر کیا اور ہر جگہ اردو کی خوشبو اور روشنی پھیلائی۔ نہ صرف انہیں دنیا میں اردو کا سفیر سمجھا جاتا تھا بلکہ حقیقتاً وہ اردو کے سفیر ہی معلوم ہوتے تھے۔ (میں اس کا شاہد ہوں کیونکہ اتفاق سے چند ممالک میں ہم دونوں ہمسفر رہے۔) وہ ساہتیہ اکادمی کے صدر رہ چکے ہیں چند سال قبل انہیں ساہتیہ اکادمی کا فیلوشپ اعزاز بھی دیا گیا جو اکادمی کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ مختلف اعلیٰ اداروں اور یونیورسٹیوں کے باقاعدہ اعزازات سے نوازے گئے تھے۔ جن میں سرسید نیشنل اکیڈمی ایوارڈ بھی شامل ہے۔ اٹلی کا میزینی گولڈ میڈل یا جو اعزاز بھی انہیں ملا ان کے چاہنے والوں کو لگتا تھا کہ وہ اعزاز اردو کو ملا ہے۔

مشہور اردو وکشن رائٹر قمر العین حیدر نے ایک بار گوپی چند نارنگ کو اردو کا ”مردِ رینے ساں“ (Renaissance man) قرار دیا تھا۔ نارنگ اپنی زندگی کو اردو زبان و ادب کی راہ میں سفرِ عشق سے تعبیر کرتے تھے۔ گرچہ ان کی مادری زبان سرائیکی تھی لیکن اپنی تقریروں میں اردو کو وہ تمام زبانوں میں تاج محل کا درجہ اور ملک کی مختلف قومیتوں میں رابطے کا پل قرار دیتے تھے۔ اردو کی چاہ میں یہ شعر اکشر وہ اپنی تقریروں میں دہراتے تھے:

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں

اک جان کا زیاں ہے سوایا زیاں نہیں

وہ کہتے تھے اردو میری ضرورت ہے، میں اردو کی ضرورت نہیں ہوں۔ ان کی شخصیت اتنی بلند تھی کہ ان سے

کے ضلع ڈگری کے گاؤں لورالائی میں پیدا ہوئے جو تب موجودہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان ایک گاؤں تھا۔ تقسیم کے بعد 1947 میں وہ سانحہ کوئٹہ کے بعد اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ریڈ کراس کے جہاز سے اپنی والدہ کے ساتھ دہلی منتقل ہوئے۔ ان کے والد ملازمت سے سبکدوش ہو کر 1956 میں دہلی آئے۔ گوپی چند نارنگ نے دہلی کالج سے اردو میں ایم اے کیا۔ 1958 میں وزارت تعلیم کے تحت ریسرچ فیلوشپ مکمل کر کے پی۔ ایچ۔ ڈی کی۔ سینٹ اسٹیفنس کالج سے 1957-58 میں درس و تدریس کا آغاز کیا۔ اس کے بعد دہلی یونیورسٹی میں لیکچرار اور 1961 میں ریڈر ہوئے۔ 1963 اور 1968 میں ولسون یونیورسٹی امریکہ میں وزنگ پروفیسر ہوئے۔ اسی دور میں منے سونا یونیورسٹی اور ولسون یونیورسٹی، ناروے میں بھی تعلیم دیتے رہے۔ ساتھ ہی اٹلی کی راک فیلر یونیورسٹی کے وزنگ فیلور رہے۔ 1974 سے تک 1981 تک جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبہ اردو میں پروفیسر رہے۔ 1981-82 میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قائم مقام وائس چانسلر تھے۔ 1986 سے 1995 تک دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر رہے۔ 2005 سے دہلی یونیورسٹی میں اور 2013 سے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پروفیسر ایمرٹس ہوئے۔

دہلی یونیورسٹی میں اردو کا شعبہ نارنگ کے مشفق استاد اور رہنما خواجہ احمد فاروقی کے زیر قیادت وزیر اعظم پنڈت نہرو کی خیر خواہی سے قائم ہوا تھا۔ اس سلسلے میں فاروقی صاحب کے ساتھ نارنگ کی جدوجہد کا احوال نارنگ کی کتاب ”خواجہ احمد فاروقی کے خطوط گوپی نارنگ کے نام“ سے معلوم ہوتا ہے۔ اپنے استاد فاروقی صاحب سے نارنگ کا از حد جذباتی لگاؤ تھا۔

نارنگ صاحب کے نصیب میں ملک اور بیرون ملک سے کئی قابل فخر اعزازات آئے۔ 2004 میں پدم بھوشن کا اعزاز ملا۔ 1995 میں ان کی کتاب ”ساختیات، پس ساختیات، مابعد جدیدیت“ پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، غالب ایوارڈ (1985)، صدر پاکستان کی جانب سے ستارہ امتیاز (2012)، اقبال سٹائن، کسم انجی فونڈیشن ایوارڈ بھی حاصل ہوئے۔ 2002 میں مجلس فروغ اردو ادب، درجہ، قطر کے ایوارڈ سے سرفراز کئے گئے۔ (اس ادارے کے وہ 1996 سے باب ہند

نظریہ ساز اردو نقاد و محقق، ماہر لسانیات و اسلوبیات گوپی چند نارنگ بروز بدھ 15 جون 2022 کو شارلٹ، امریکہ میں 91 سال کی عمر میں اپنے بیٹے ترون نارنگ کے گھر میں افراد خاندان کی موجودگی میں انتقال فرما گئے۔

نارنگ انوکھی صفات کا مجموعہ تھے۔ معلم اردو، منفرد ادیب، سیمیناروں، کانفرنسوں اور علمی تقریبات کے بے مثال انتھک منتظم، کارواں ساز شخصیت کے مالک، اردو زبان کی بقا کے لئے ہر ممکن اقدام کرنے والے گوپی چند نارنگ کی ہمسری کا دعویٰ کوئی نہیں کر سکتا۔ اردو کو وہ نکشیری ساج کی علامت گردانتے تھے۔ تحریک آزادی اور اردو شاعری، اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب جیسی اپنی کتابوں میں یہ بات انہوں نے بار بار پورے پورے جواز کے ساتھ لکھی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ زبانوں پر گفتگو کرتے ہوئے جنونیت اور انتہا پسندی کو رد کر دینا چاہئے۔ ان کا لسانی نظریہ سائنسی علم اور باہمی رواداری پر مبنی تھا۔ گرچہ نارنگ اردو کو اس کے اصل رسم الخط کے ساتھ برقرار رکھنے کے حامی تھے لیکن اردو اور ہندی کی خلتی حقیقت [یا فطرت] کو برصغیر کے لسانی تاریخی پس منظر میں دیکھتے تھے۔ دونوں زبانوں میں انہیں گوشت اور خون کا رشتہ نظر آتا تھا۔ ان کے نزدیک ہندی کے بغیر اردو اردو نہیں تھی اور اسی طرح ہندی بھی اردو کے بنا مکمل نہیں تھی۔ ہندی اور سنسکرت سے اردو نے بہت کچھ لیا ہے۔ گرامر میں بھی اور صوتی نظام میں بھی اردو نے ہندی اور سنسکرت کے اثرات قبول کئے ہیں۔ اردو میں فارسی اور عربی کا ہر تلفظ ادا کیا جاسکتا ہے لیکن ٹ، ژ، ڈ جیسے حروف کی آوازیں اردو میں سنسکرت اور ہندی سے ہی آئی ہیں۔ عربی میں پ اور گ حروف بھی نہیں ملتے۔ نارنگ ماہر السنہ تھے۔ زبانوں کی ایجاد اور حروف کے مخرج پر غور کرنا ان کی علمی ضرورت تھا۔ اردو اپنے اسکرپٹ میں ہند آریائی زبان ہے لیکن دراوڑی لہجوں سے بھی متاثر ہے اور ان تمام عناصر نے اردو کو اس طرح مکمل کیا ہے کہ ہندوستان کے نکشیری نظام میں اسے سب سے اگلا مقام حاصل ہے۔ ہر زبان کا رسم الخط اپنی پہچان اور خوبصورتی رکھتا ہے۔ اس لئے ہر زبان کی اصلیت اور افراہیت کو برقرار رہنا چاہئے۔

گوپی چند نارنگ 11 فروری 1931 کو بلوچستان

انتظار حسین پر ہوں ادب میں سموئی اور سوئی ہوئی تہذیب و ثقافت کو جگاتے ہیں۔ ان پر کئی رسالوں کے خاص شمارے نکلے اور کتابیں شائع ہوئیں۔ لیکن انشاء کا خاص نمبر سب سے زیادہ اہتمام سے نکلا۔ اور عالمگیر اہمیت کا حامل ہے۔

اندیشہ اب اس کا ہے کہ اس زمانے کے آخری بیدار ذہن اردو نقاد کے دنیا سے کوچ کر جانے کے بعد اردو تنقید خدانہ کرے کہ لمبی نیند سو جائے۔

اردو زبان و ادب کو اس دولت بیدار کے بخشہ گوپی چند نارنگ کے کارناموں اور یادوں کو سلام!

☆☆☆

اگر اعلیٰ محقق بھی ہو تو تاریخی حقائق پر اپنی شعوری نگاہ ڈال کر متن سے نئے مفہیم برآمد کر لیتا ہے۔ نارنگ اس جدید نظریہ کے حامی تھے کہ لکھاری نہیں لکھتا، متن لکھتا ہے۔ ”ادب کا بدلتا منظر نامہ“ اور ”تحریک آزادی اور ہندوستان کی اردو شاعری“ یا ”ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت“ جیسی کتابیں جو نارنگ نے لکھیں اس کے پیچھے ان کا تاریخی حقائق کا از سر نو جائزہ لینے کا جتن شامل ہے۔ بڑے تنقیدی کام یا کارنامے سکہ بند زبوں کا نتیجہ نہیں ہوتے۔ نارنگ کے مضامین چاہے امیر خسرو پر ہوں، میر وغالب پر ہوں، دلی کی کرنداری بولی پر ہوں، ساحر لدھیانوی کے بھجوں پر ہوں، فراق، فیض، قرۃ العین حیدر

قریب ہونے کا ارمان یا ان کے ذریعہ انعام و اعزاز پانے کی خواہش کرنے والوں کی کمی کبھی نہیں رہی۔ اور اپنا مطلب پورا ہو جانے کے بعد انہیں چرکہ یا ہزیمیت دینے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ معلوم نہیں ان کا سینہ 56 اچھ کا تھا کہ نہیں لیکن وہ نڈر بلوچ تھے اور دشمنوں کو ان کی کرنسی میں جواب دینے کی اہلیت بھی ان میں خوب تھی۔ بدخواہ انہیں مصروف رکھتے تھے اور وہ اپنے بدخواہوں کو۔ بقول یوسف ناظم وہ ”نا۔ رنگ“ تھے جس پر کوئی رنگ نہیں چڑھتا۔ طاقتور ارادوں کے آدمی تھے۔ اپنی تقریروں میں یہ بات اکثر کہتے تھے ”خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے حاسد نہیں محسود بنایا ہے“۔ موصوف میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ کسی سے اپنے آزمودہ دوستوں کی بُرائی سنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ (میں اس کا گواہ ہوں)۔

گوپی چند نارنگ 45 اردو اور 15 انگریزی و ہندی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی سبھی کتابوں کا ایک نظر یا ایک نظریہ سے جائزہ نہیں لیا جاسکتا۔ سب کے موضوع الگ ہیں اور ہر کتاب قاری سے ایک الگ ویژن کا مطالبہ کرتی ہے۔ ان میں المانامہ جیسی کتاب ہے تو ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں بھی ہے۔ فلشن کے فن سے متعلق ”اردو افسانہ روایت اور مسائل“، ”ادب کا بدلتا منظر نامہ“، ”ادبی تنقید اور سلیویات“، ”امیر خسرو کا ہندوی کلام“، ”سائنز کر بلا بطور شعری استعارہ“، ”تحریک آزادی اور ہندوستان کی اردو شاعری“، ”ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت“، ”دلی دکنی، تصوف، انسانیت اور محبت کا شاعر“، ”انیس شاسی“، ”بیسویں صدی میں اردو ادب“، ”اطلاقی تنقید“، ”فراق گورکھپوری“، ”سجاد ظہیر“، ”اقبال کا فن“، ”فلشن شعریات“، ”اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب“ ان سب کتابوں کا مطالعہ زمانے نے الگ الگ ذہن سے کیا۔

حالیہ کتابوں میں ”غالب، معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات“ مطالعہ غالبیات کے کئی نئے رخ دکھاتی ہے۔ کسی متن کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ اس کے صرف نصابی یا جامعاتی پہلو پر غور کرنے تک خود کو محدود نہیں رکھتے تھے۔ معنی کی تلاش میں وقت کی حرکی صفات ان کے پیش نظر ہوتی تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ اطلاقی تنقید وقت کی نئی کروٹوں کے ساتھ لفظوں کے مفہیم بدل سکتی ہے۔ اگر اس نظریہ پر گوپی چند نارنگ کاربند نہ ہوتے تو غالب، معنی آفرینی، جدلیاتی وضع شونیتا جیسی کتاب نہیں لکھ سکتے تھے۔ یہ مانا کہ لکھا ہوا لفظ ٹھہری ہوئی شے بن جاتا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ معنی کے پاؤں میں وقت بیڑی ڈال دے۔ وقت زبان کا تناظر بدل سکتا ہے (اور بدل بھی دیتا ہے) وہ معنی کی کروٹ بدل سکتا ہے۔ نظریہ ساز نقاد

## علی گڑھ سے گوپی چند نارنگ کے رشتے

### امریکہ کے ڈاکٹر عبداللہ علیگ کی ایک محفل

علی گڑھ نارنگ رشتوں پر علی گڑھ والوں نے خوب خوب لکھا ہے،

علی گڑھ سے نارنگ کے گونا گوں رشتے اس وقت سے قائم تھے جب وہ دہلی یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے پہلی بار علی گڑھ آئے تھے، اور لنن لائبریری سے استفادہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ ۱۹۵۳ء یا ۱۹۵۴ء بات ہے۔ خواجہ احمد فاروقی انہیں بڑا عزیز رکھتے تھے، اپنے نام خواجہ صاحب کے خطوط انہوں نے خدا بخش سے کتابی صورت میں شائع بھی کرا دیئے تھے۔ علی گڑھ سے ان کے سب سے خوبصورت سب سے قیمتی اٹوٹ رشتے اس وقت قائم ہوئے جب انہیں علی گڑھ نے ۱۹۱۳ء کے آس پاس اعزازی ڈگری دی۔

علی گڑھ کے ڈاکٹر عبداللہ نے نارنگ کی یاد میں ایک محفل سجا ئی تھی، جس میں کسی نے نارنگ کی زبان سے ایک شعر سنایا تھا (کس نے؟ شاید افتخار عارف نے)۔ جو نارنگ کا نہیں تھا، انہوں نے صرف پڑھا تھا۔ وہ شعر یہ تھا:

..... - لذت عشق گئی غیر کے مرجانے سے

یہ شعر آپ کو یاد ہو تو پورا کر دیں۔



ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو علی گڑھ کی ڈاکٹر آف لیٹرس کی اعزازی ڈگری

## List of contents of Aligarh Diaspora 1-16

### علی گڑھ ڈائسپورہ کے سولہ شماروں کے مشتملات

- Agwani in Aligarh-9
- Aligarh Centenary Publications by Sir Syed Academy Aligarh-6
- Aligarh Centenary Publications of KBL-6
- Aligarh speaks to the Nation, by Vice Chancellor Abdul Azis-2
- Azad's Ramgarh Speech: Sir Syed Ardent disciple-3
- Habib sb, Prof. : The Arabian Apotle-8
- Iqbal translated, by Saiyidain-10
- Justice Hidayatullah: on Justice Mahmood-12
- Justice Mahmood, by Advocate Prabodh Gor-13
- Justice Mahmood, by Advocate Srivastava, Guru Dayal-14
- Justice Mahmood, by Justice Hidayatullah-12
- Justice Mahmood, by Justice Subba Rao-13
- Justice Mahmood, by K.L. Misra-11
- Justice Subba Rao on Justice Mahmood-13
- Parvaiz Talib, on Syed Hashim Ali-8
- Saiyidain, K.G. : on Iqbal's Poetry, by Dr. Shayesta-6
- Saiyidain: Iqbal translated-10
- Sir Syed Academy Centenary Publications-6
- Sir Syed speaks at Patna (Guha)-1
- Sir Syed's Ardent disciple Azad's Ramgarh Speech-3
- Sufism, by Askari sb-3
- Syed Hashim Ali, by Parvaiz Talib-8
- Syed Hashim Ali, by Zaheer Babar-8
- The power-play to control MAO college-15
- Thus spake Sir Syed: (i) Why Aligarh College (ii) Hindu Muslim, my two eyes (iii) All Indians are one Nation (iv) Hindu & Muslims: inhabitant of one country (v) India Cannot progress without secularism (vi) My approach, secular (vii) Syed the great, by K.A. Nizami-10
- Vahiduddin : A Muslim's Prayer-4
- Vicar of Hyderabad, by Tariq Ghazi-7
- Vice Chancellor Agwani, JNU-9
- Wajihuddin Mumbai, (best author on Aligarh Centenary)-6

### Urdu Section:

- A leaf from editor's dairy-6
- Aftaf Shamsi: important poet from Aligarh-16
- Agwani VC of JNU, ex-Fellow of Islamic Studies, Aligarh-9
- Aligarh Alumnus of Amroha, in Delhi, Khurshid Mustafa Rizvi-2
- Aligarh and Narang: AMU confers humourist causa, Doctor of literature-16
- Aligarh Diaspora: list of 16 issues-16
- Aligarh History of Urdu literature" project: a photo group of the members, by Rahat Abar-12
- Aligarh past and present, by Rasheed Ahmad Siddiqui-4
- Aligarh: outstanding intellectual names-2

- Arif Rizvi on Dr. Maqbool-10
- Asghar Abbas wins biggest literary Award of 5 lakhs-6
- Asghar Abbas: his book *ziya Bar Khutoot-*
- *Chhiththi a'ae hai*, by Razi Ahmad Chishti-14
- Daispora-Alig letters-3,4,5,8,9,11
- Dr. Arzoo, Mukhtaruddin Ahmad: *Naqsh-e Dawaam*-6
- Dr. Arzoo: his photo-6
- Dr. Zakir Husain: select pieces-4
- Faizan Mustafa addresses old boys of Lucknow-7
- Hakeem Abdul Hameed: last Chancellor of 20<sup>th</sup> century-2
- Hasrat Mohani & Ambedkar in Constituent Assembly-12
- Hasrat Mohani first Indian freedom fighter: in British Jail-11
- If Sir Syed were living today, by Shaheen Nazar-11
- Irfan Habib, by Tariq Ghazi-9
- Jamia Millia of Aligarh: progressive movement starts-2
- Josh Malihabadi, half alig-11
- Khalilur Rahman Azmi: his forgotten poem-8
- Khalilur Rahman Azmi's most read Verse-8
- Khurshidul Islam & Ahmad Nadeem Qasmi most outstanding poets-3
- *Kiski Nazaqr lag gayi*: one of the best writings of the year (monthly Insha Kolkata)
- Letters to Diaspora-5
- Mansoor Agha: his book, by Rahat Abrar-15
- Maqbool sb: by Riyazur Rahman Khan Sherwani, Yasin Mazhar Siddiqi, Arif Rizvi-10
- Maulana Azad : Aligarh Convocation Address-3
- Munir Farshori-2
- *Naqsh-e Dawam* of Arzoo sb-6
- Nawab Rahmatullah Khan on Ali Yawar Jung-14
- Old boys of Lucknow celebrate Sir Syed festival-16
- Parvaiz Talib on Syed Muhammad Afzal-2
- Qayyum Qaid, by Arzoo sb-6
- Qayyum Qaid-8
- Rahat Abrar on Mansoor Agha-15
- Rahat Abrar on Syed Hamid-15
- Rasheed Ahmad Siddiqui: his letter: ed. by Dr. Zakia Jeelani-2
- Razi Ahmad Chishti-14
- Remembering the Murshid-15
- Riyazur Rahman Khan Sherwani: on Dr. Maqbool
- Sayidain-6
- Shafiq Bhai (Jamshedpur)-9
- Shah Hasan Ata-5
- Sir Syed and revolt against British Rulers, by Abul Khair Kashfi-16
- Sir Syed and revolt against British Rulers, by Shafey Kidwai-16
- Sir Syed cited-13



- Sir Syed in revolt against British in justice-15
- Sir Syed ka Akhri Chanda-2
- Sir Syed serves Islam, by publishing Davinport-15
- Sir Syed speaks-12
- Sir Syed, by Maulana Azad-3
- Sufism (Aligarh Magazine 1926)-5
- Syed Abul Khair Kashfi-15
- Syed Hamid by Rahat Abrar-15
- Syed Hamid, by Prof. Iqbal-3
- Syed Hamid: Autobiography-3
- Syed Hamid: Reminiscences, by Parvaiz Talib-13
- Tariq-2 طارق چوہدرکار کا نسل سفینہ سوخت
- The best Editorial of the year (Monthly Insha, Kokata)-11

- The best poet, a genius : the son of an Aligarhian-8
- The last Chancellor of Aligarh of the 20<sup>th</sup> century: Hakim Abdul Hameed-2
- Vice Chancellor Ali Yawar Jung, by Rahmatullah Khan Sherwani-14
- Vice Chancellor Dr. Aleem, by Prof. Iqbal-7
- Vice Chancellor Khushroo, by Prof. Iqbal-1
- Vice Chancellor M.N. Farooqui-1
- Vice Chancellor Syed Hashim Ali-5
- Vice Chancellor Tyabji, Shayesta Khan-11
- Yaqoob Yunus, by Akhtar Husain Aftab-2
- Yasin Mazhar Siddiqi, on Dr. Maqbool-10

\*\*\*

## اردو (اصل)

- سید حامد، از اقبال صاحب، ہمدرد پبلیکیشنز-۳
- سید حامد، از راحت ابرار-۱۵
- سید محمود، از جسٹس سٹاروا-۱۳
- سیدین صاحب-۶
- شاہ حسن عطایا کی کتاب ”مقامات دل“-۵
- شفیق بھائی (جشن پور)-۹
- صوفیہ، از علی گڑھ میگزین 1926-۵
- طارق (بہت مقبول نام)-۲
- عارف رضوی کا مضمون مقبول صاحب پر-۱۰
- عرفان حبیب (از طارق غازی)-۹
- علی گڑھ تاریخ ادب اردو، پروڈیکٹ کا یادگار گروپ، از راحت ابرار-۱۲
- علی گڑھ ڈائریکٹوریٹ کے سولہ شماروں کی فہرست-۱۶
- علی گڑھ سے گوپی چند نارنگ کے رشتے: ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو علی گڑھ کی ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری تفویض-۱۶
- علی گڑھ کا جلسہ تقسیم اسناد از ابوالکلام آزاد-۳
- علی گڑھ کا ماضی و حال: از رشید صدیقی: 1970 کا خطبہ-۴
- علی گڑھ کے بیسویں صدی کے آخری چانسلسر: حکیم عبدالحمید-۲
- علی گڑھ کی جامعہ ملیہ: ترقی پسند ادب کا آغاز-۲
- علی گڑھ کے سرسید بول رہے تھے، از ایڈیٹر-۱۲
- علی گڑھ کے فرزند، امر وہہ اور دہلی میں: خورشید مصطفیٰ رضوی (رشید صاحب کا ان کی کتاب پر دیباچہ)-۲
- علی گڑھ کے، آج کے، بڑے دانشوروں کے اساتذہ گرامی-۲
- علی یاور جنگ، از رحمت اللہ خاں شروانی-۱۲
- علی گڑھ کے خط (انگریزی اردو میں)-۳، ۴، ۵، ۸، ۹، ۱۱
- علیم صاحب و انس چانسلسر، از اقبال صاحب، ہمدرد پبلیکیشنز-۱۶
- فیضان مصطفیٰ نے کہا (لکھنؤ اولڈ بوائز جلسہ کو خطاب)-۱۶
- قاضی عبدالودود: ایک بھولے بسرے علیگ-۷
- قیوم قائد: ایک خودنوشت: علی گڑھ میں میرے چار برس-۸
- قیوم قائد صاحب پر آرزو صاحب کا مضمون-۶
- کس کی نظر لگ گئی اسے: از سین اعجاز (رسالہ انشاء سے)-۱۱
- مرشد اولین کی یاد میں، از ایڈیٹر-۱۵
- مقبول صاحب، از ریاض الرحمن خاں شروانی، یاسین مظہر صدیقی، عارف رضوی-۱۰
- منصور آغا کتاب، از راحت ابرار-۱۵
- منیر فرخ شوری-۲
- نقش دوام مصنفہ آرزو صاحب کا ذکر خیر-۶
- وائس چانسلسر بدر الدین طیب جی، از شائستہ خان-۱۱
- وائس چانسلسر ڈاکٹر علیم-۷
- وائس چانسلسر سید ہاشم علی-۵
- وائس چانسلسر ایم این فاروقی-۱
- یاسین مظہر صدیقی کا مضمون مقبول صاحب پر-۱۰
- یعقوب پونس (از اختر حسین آفتاب)-۲

\*\*\*

- ابوالخیر کشفی: سرسید کی باغبانہ تحریریں-۱۵
- ابوالکلام آزاد: علی گڑھ کا جلسہ تقسیم اسناد-۳
- اردو کی بہترین تحریروں میں سے ایک: ہنگامہ جہی تہذیب کہاں کھو گئی-ف- سین- اعجاز (انشاء کا ایک ادارہ)-۱۱
- اصغر عباس (ضیاء خطوط)
- اصغر عباس کو پانچ لاکھ: مبارکباد-۶
- اگوانی، پہلے علی گڑھ کے اسلامک انڈیز کے فیو، پھر جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے وائس چانسلر-۹
- اولڈ بوائز لکھنؤ جلسہ کی روداد: عید سرسید-۱۶
- ایک علیگ باپ کا تحفہ: خاندان صادق پور کا ایک تیرہ سالہ جینٹلمن شاعر-۸
- آرزو صاحب/ڈاکٹر مختار الدین احمد کی کتاب نقش دوام کا ذکر-۶
- آرزو صاحب کی ایک تصویر-۶
- آفتاب شمس مرحوم، اہم علیگ شاعر-۱۶
- پرویز طالب: سید محمد افضل-۲
- جوش ملیح آبادی (نیم علیگ) کی نعت-۱۱
- چٹھی آئی ہے، از رضی احمد چشتی-۱۳
- حسرت موہانی اور امیڈ کر، ایک فوٹو (دستور ساز اسمبلی)-۱۲
- حسرت موہانی، علی گڑھ کا جیلا: انگریزی کی جیل میں پہلا قیدی-۱۱
- حکیم عبدالحمید، بیسویں صدی میں علی گڑھ آخری چانسلسر-۲
- خسرو الیم، از پرویز فیروز اقبال، ہمدرد-۱
- خطوط (انگریزی)، از شاہ عمر عطا-۵
- خلیل الرحمن اعظمی: بھولی بری عاقبت شدہ نظم-۸
- خلیل الرحمن اعظمی کا سب سے زبردست شعر-۱۵
- خورشید الاسلام اور احمد ندیم قاسمی: معاصر اردو کے سب سے بڑے شاعر-۳
- دربار سرسید (انگریزی) تصاویر از افضل عثمانی-۴
- ڈائری کا ایک ورق، از ایڈیٹر-۶
- ڈاکٹر حسین: دل کے خون سے لکھی تحریریں-۴
- راحت ابرار کی تحریریں: سید حامد پر-اور- منصور آغا کی کتاب پر-۱۵
- رحمت اللہ خاں شروانی کا مضمون علی یاور جنگ پر-۱۲
- رشید احمد صدیقی کے خط واداشت میں (ذکرہ جیلانی وغیرہ کے مرتبہ)-۲
- رضی احمد چشتی کا مضمون: چٹھی آئی ہے-۱۳
- ریاض الرحمن خاں شیر وانی کا مضمون: مقبول صاحب پر، ۱۰
- سرسید آج ہوتے تو- از شاہین نظر-۱۱
- سرسید کا احتجاجی کردار، (پیشکش: شافع قدوائی)-۱۶
- سرسید کا احتجاجی کردار-۲ شافع قدوائی کے ردیف قافیے میں- ابوالخیر کشفی سے انتخاب-۱۶
- سرسید کا آخری (۲۸ مارچ ۱۸۹۸) کا چہرہ-۲
- سرسید کے بارے میں مولانا آزاد نے یہ بھی لکھا تھا (لسان الصدق سے)-۳
- سرسید کی خدمت اسلام: ڈیون پورٹ، بیگنس-۲
- سرسید نے کہا تھا: کامیابی کا راستہ- تاریخی ورثہ کی حفاظت کرو-۱۳
- سرسید: انگریزی رائج کاسب سے بڑا باغی، از ابوالخیر کشفی-۱۵
- سید ابوالخیر کشفی کے بارے میں، از اش-۱۵
- سید حامد بقلم خود-۳
- سید حامد کے علی گڑھ کی یادیں، از پرویز طالب-۱۳